تحریکِ اسلامی

اسلامی تحریکیں، ماضی اور حال

روحِ جہاد کی تجدید

خلیل احمد حامدی

جہاد اور اس کے اثرات

مسلم امت کو جس چیز نے ہمیشہ فعّال اور تیز رَو بنائے رکھا وہ جہاد تھا۔ جہاد کی بدولت مسلمانوں نے دنیا کے اندر سے ظلم و ستم، شرک و کفر اور انسانی خدائی کا قلع قمع کیا اور انسان کو اوہام و خرافات کی زنجیروں سے نجات دی۔ اور پھر جہاد کی بدولت علم و تحقیق کے گلستان پیدا کیے، عدل و انصاف کی بہاریں برپا کیں، انسانوں کو رنگ و نسل اور تفاخر و تکاثر کے پیمانوں سے ناپنے کے بجائے ایمان و تقویٰ کے پیمانوں سے ناپنے کی طرح ڈالی۔ جہاد نے مسلمان نوجوانوں کو تن آسانی کے بجائے جفاکشی، اور عیش کوشی کے بجائے پاک نفسی کے جوہر سے آراستہ کیا۔ ان کو اپنوں کے لیے موم اور دشمنوں کے لیے سنگِ خارا بنا دیا۔ مسلم امت کو پسپائی کے بجائے **پیشرفت، سرافگندگی** کے بجائے سرفرازی اور سفلہ پیشی اور دون ہمتی کے بجائے علو پسندی اور جگر داری کا درس دیا۔ جہاد کی برق و رعد کے سامنے قیصر بھی مات کھا گیا اور کسریٰ بھی۔ بحرالکاہل سے لے کر بحرِ ظلمات تک اسلام کا سایۂ رحمت پھیل گیا۔ دیانا کی دیواروں تک اس کی گونج پہنچ گئی۔ اندلس کی تاریک دنیا اس کی روشنی سے چمک اٹھی۔ الغرض جب تک مسلم امت کے اندر روحِ جہاد کام کرتی رہی، وہ خوددار و پرشکوہ رہے اور جونہی یہ روح رخصت ہوئی، ان کا شیرازہ بکھر گیا اور وہ منتشر بھیڑوں کے گلے بن گئے۔ علم و فن تو ان کے ہاں سے رخصت ہوا ہی تھا، وہ آزادی و استقلال بھی کھو بیٹھے اور آج تک ماضی کی غلطیوں کی سزا بھگت رہے ہیں۔

استعماری طاقتیں مسلمانوں کی قوت کا حقیقی راز سمجھتی تھیں۔ انھوں نے مسلمانوں پر اپنے

تسلط کے منحوس پر پھیلانے کے بعد جہاد کا تصور مسلمان کے دل و دماغ سے کھرچنے کی کوشش کی۔ اور مسلمانوں کے ایک طبقے کو اس بات کا قائل کرنے میں کامیاب ہو گئیں کہ جہاد سے مراد صرف مدافعت ہے اور بہتر ہے کہ اس لفظ کو اسلام کی ڈکشنری سے نکال دیا جائے کہ اس سے خون کی بو آتی ہے۔ اسلامی جہاد کے بارے میں تو ان طاقتوں کا یہ رویہ تھا' مگر جب انھیں اپنے مفادات کی حفاظت کی ضرورت پیش آئی تو پہلی جنگِ عظیم میں بھی اور دوسری عالمگیر جنگ میں بھی وہ مسلمان نوجوانوں کو ایندھن بناتی رہیں۔ الجزائری نوجوان فرانس کے لیے جرمنوں کے خلاف خون کے نذرانے پیش کرتے رہے اور ہندو پاک کے مسلمان انگریزوں کی خاطر عراق و فلسطین میں اور برما و ملایا میں جانیں دیتے رہے۔ اور اب امریکہ کا نیو ورلڈ آرڈر صومالیہ میں اپنے اڈے قائم کرنے کے لیے اور بحرِ احمر کو اپنی تحویل میں لینے کی خاطر "پاکستانی مجاہدین" کو مظلوم صومالیوں کی سرکوبی کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ اور اگر یہی "پاکستانی مجاہدین" ستم رسیدہ کشمیریوں کی حمایت میں آواز اٹھائیں تو انھیں "دہشت گرد" کہا جاتا ہے۔

اسلامی تحریکوں کا یہ زبردست کارنامہ ہے کہ انھوں نے صدیوں سے مردہ روحِ جہاد کو دوبارہ ملتِ اسلامی کے اندر زندہ کر دیا ہے۔ اب انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک اور ترکی سے لے کر **موزمبیق** تک جہاد کے نغمے گونج رہے ہیں۔ اور یہی لہر مغرب کو مخبوط الحواس کیے جا رہی ہے۔ مگر جس قدر اس لہر کے خلاف مغرب کے قائدین اور مغرب کے ذرائع ابلاغ پروپیگنڈے کی توپیں کھولے ہوئے ہیں' اسی قدر اس میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

نظریۂ جہاد کو اپنی اصل حقیقت کے ساتھ سب سے پہلے ہندوستان کے ایک ۲۳ سالہ نوجوان نے پیش کیا۔ اس نوجوان کا نام ابو الاعلیٰ مودودی تھا اور وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے نمائندہ اخبار "الجمعیت" دہلی کا مدیر مسئول تھا۔ اس نوجوان نے اخبار کے صفحات پر ۲۲ قسطوں میں اسلام کے قانونِ جنگ پر ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون کو بعد میں جناب علامہ سیّد سلیمان ندویؒ نے "الجہاد فی الاسلام" کے نام سے شائع کیا۔ جہاد کے موضوع پر دورِ حاضر کی یہ پہلی کتاب ہے جو ہند کی سرزمین میں منصہ ظہور پر آئی۔ اس کے بعد امام حسن البناؒ نے "جہاد فی سبیل اللہ" کے عنوان سے ایک کتابچہ تحریر کیا۔ یہ وہ دور تھا کہ مسلمانوں کے اہلِ علم و دانش' جہاد کے بارے میں مسلسل صفائیاں اور معذرتیں پیش کر رہے تھے۔

یہ تو فکری میدان میں دعوتِ جہاد کا آغاز تھا۔ ۱۹۴۷ کو جب اقوامِ متحدہ کی طرف سے "اسرائیل" کے قیام کا اعلان ہوا اور فلسطین کا بہت بڑا حصہ "اسرائیل" کو دیا گیا تو اخوان

المسلمون نے یہودیوں کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا اور ان علاقوں پر جو اسرائیل کے حصے میں آ رہے تھے' قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ گو یہ جہاد چند ماہ تک جاری رہا۔ مگر اخوانی مجاہدین نے شجاعت و شہادت کی ایسی مثالیں قائم کیں کہ قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ ہو گئی۔ یہ تفصیلات معلوم کرنے کے لیے ملاحظہ ہو استاذ کامل الشریف کی کتاب جو خود بھی جہاد میں شریک رہے: "الاخوان المسلمون فی حرب فلسطین"۔

جہادِ افغانستان کے اثرات

جہادِ فلسطین کے بعد سب سے بڑا اور طویل جہاد افغانستان میں برپا ہوا ہے۔ یہ جہاد براہِ راست دنیا کی دوسری بڑی طاقت سوویت یونین کے ساتھ تھا۔ ۱۳ سال (۱۹۷۹۔ ۱۹۹۲) تک افغانستان کے کوہ و دمن' خونِ شہیداں سے لالہ رنگ رہے۔ یہ جہاد صرف افغانوں تک محدود نہ رہا' بلکہ اس کی لَے اکنافِ عالم تک پہنچی اور دنیا میں ہر اسلامی تحریک نے اس میں حصہ لیا۔ اپنے نوجوان بھی بھیجے' رقوم اور سامان بھی بھیجا۔ خود اپنے اپنے ملک میں جہاد کی فضا پیدا کی۔ جہاد کے موضوع پر اخبارات و رسائل نے بڑے وقیع مضامین شائع کیے۔ فلمیں تیار ہوئیں۔ بیش قیمت کتابیں تحریر کی گئیں۔ عصرِ حاضر میں جہاد کے احکام و آداب کی تشریح کی گئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ افغانستان میں ٹریننگ کیمپ قائم کیے گئے جن میں نوجوانوں کو حربی تربیت بھی دی جاتی رہی اور روحانی بھی۔ جن نوجوانوں نے ان کیمپوں سے تربیت پائی ہے اور وہ افغانستان میں روسیوں سے لڑتے رہے ہیں' ان کے دلوں میں شوقِ جہاد کی ایسی شمع روشن ہو گئی ہے کہ اب اسے کوئی نہیں بجھا سکتا۔ امریکہ اپنی کسی مصلحت کی خاطر اس وقت جہادی کاروائیوں کو نظرانداز کرتا رہا۔ مگر اب وہی امریکہ مجاہدین کو دہشت گرد قرار دیتا ہے' لیکن بات آگے بڑھ چکی ہے۔

انتفاضہ فلسطین

جہادِ افغانستان کے دوران ہی ۱۹۸۹ میں فلسطین میں انتفاضہ برپا ہو گیا۔ اس کو جنم دینے والی فلسطین کی اسلامی تحریک تھی۔ غزہ کی اسلامی یونیورسٹی کے نوجوان طلبہ جن کے کان جہادِ افغانستان کی داستانیں سنتے رہتے تھے اور جن کے اساتذہ خود بھی جذبۂ جہاد سے سرشار تھے "اسرائیل" کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ مسجدوں کو انھوں نے اپنا مرکز بنا لیا اور پتھروں کو ہتھیار۔ انتفاضہ کا آغاز گو چند نوجوانوں سے ہوا' مگر یہ تحریک پوری فلسطینی قوم میں یکایک پھیل گئی۔ اس میں ان فلسطینیوں نے بھی حصہ لیا جو ۱۹۶۷ سے اسرائیل کی غلامی میں آ گئے تھے۔ یعنی غزّہ اور مغربی

کنارے کے باشندے۔ اور وہ بھی اس میں داخل ہو گئے جو ۱۹۴۸ سے اسرائیل کی رعایا بنا دیے گئے تھے اور انھیں فلسطینیوں کے بجائے "اسرائیلی" کہا جاتا تھا۔ انتفاضہ نے یہودیوں کے ہوش و حواس گم کر دیے۔ اسرائیلی حکام نے انتفاضہ کو بیخ و بن سے اکھاڑنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ مگر ہر اسرائیلی ضرب اس میں مزید زندگی پیدا کرتی رہی۔ ۴ برسوں کے اندر انتفاضہ میں حصہ لینے والے ایک ہزار نوجوان شہید ہوئے۔ ۲۵ ہزار مفلوج ہوئے اور ۳۰ ہزار مختلف اوقات میں جیلوں میں ڈالے گئے۔ فلسطین کی تمام مساجد جہاد کے اڈے بن گئیں۔ لوگوں میں اسلام کی طرف غیر معمولی رجوع ہو گیا' بلکہ پوری فلسطینی قوم میں باہمی تعاون و اخوت کی غیر معمولی روح ابھر آئی۔ اندرونِ فلسطین کے لوگ یاسر عرفات کو بھول گئے اور ان کا اصل لیڈر احمد یٰسین بن گیا۔ اور یہ علامات واضح ہونے لگیں کہ اسرائیل کے لیے انتفاضہ سے نجات پانا آسان نہیں ہے۔ اسرائیل نے انتفاضہ کے تین سو سے زائد رہنما چن کر انھیں خانہ بدر کر دیا اور وہ لوگ سخت سردی کے زمانے میں لبنان سے متصل علاقے مرج العامر میں پناہ گزین ہو گئے' مگر اس اقدام نے مزید آتشِ جہاد بھڑکا دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امریکہ اور یورپی طاقتوں نے مل کر یاسر عرفات اور تنظیم آزادیِ فلسطین کے چند لوگوں کو لے کر خفیہ طور پر ناروے میں مذاکرات شروع کیے جو آخرکار واشنگٹن میں: "غزہ و اریحا" کے نام سے فلسطین فروشی کے معاہدے پر منتج ہوئے۔ ان حالات نے جہاد کو اور تیز کر دیا ہے۔ اور اب "حماس" ہی فلسطینی قوم کی امنگوں کا مرکز بن گئی ہے۔

بوسنیا کی جنگ

فروری ۱۹۹۲ سے بوسنیا کی سرزمین بھی جہاد آشنا ہو چکی ہے۔ بوسنیا نے سابقہ یوگوسلاویہ کی دوسری جمہوریتوں کے نقشِ قدم پر اپنی آزادی کا اعلان کیا تو سرب جمہوریہ نے اسے تسلیم نہ کیا' بلکہ معدوم یوگوسلاویہ کی وراثت کی دعویدار بن کر اس نے بوسنیا پر حملہ کر دیا۔ خود بوسنیا کے اندر رہنے والی سرب نسل کی آبادی نے بھی سرب جمہوریہ سے تعاون کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سربوں نے بوسنیا کے ستر فیصد علاقے پر قبضہ کر لیا یا اس پر وحشیانہ حملے کیے۔ بوسنیا کے پاس نہ فوج تھی اور نہ اسلحہ۔ معدوم یوگوسلاویہ کی تمام فوج اور اسلحہ بلغراد (دارالحکومت جمہوریہ سربیا) میں تھا۔ بوسنوی مسلمان یکایک شدید ظلم و ستم کا شکار ہو گئے۔ اور تھوڑے ہی عرصے کے اندر ایک لاکھ انسان شہید اور اتنے ہی نظربندی کے کیمپوں میں محبوس ہو گئے۔ پچاس ہزار کے قریب بوسنوی عورتوں کی عزت پامال ہو گئی اور ہجرت کرنے والوں کی تعداد پانچ لاکھ تک پہنچ گئی۔ مسلمان حکمران

بے حس بیٹھے رہے۔ بوسنیا کے دفاع کا سارا بوجھ بوسنیا کی نوزائیدہ حکومت اور بوسنیا کے نوجوانوں پر آ پڑا۔ ان پر مزید ستم یہ ہوا کہ اقوامِ متحدہ (جو اس وقت امریکہ کی کنیز بن چکی ہے) کی طرف سے بوسنیا کو اسلحہ کی سپلائی پر پابندی لگا دی گئی۔ بقول سعدی: سنگ ہارا بستند و سگاں را کشادند۔ اس صورتِ حال نے بوسنوی نوجوانوں کے اندر عظیم الشان جذبۂ جہاد پیدا کر دیا۔ ان نوجوانوں کے اندر وہ گروہ خاص طور پر پیش پیش ہے جو عالمِ عرب کی یونیورسٹیوں میں پڑھتا رہا۔ اور وہاں مولانا مودودیؒ، حسن البناؒ اور سیّد قطبؒ کی دعوت سے متاثر ہوا۔ یہ گروہ اب "مسلم فورسز" کے نام سے بوسنیا آرمی کا ایک حصہ ہے۔ اس کی قیادت خود بوسنیا کے نوجوان کر رہے ہیں۔ (خاکسار خود مسلم فورسز کے کمانڈروں سے زغرب اور سپلٹ میں مل چکا ہے) جب سے ان نوجوانوں نے جہاد کا راستہ اختیار کیا ہے اور جنگی قیادت سنبھالی ہے سربوں اور کروٹوں سے بہت سے علاقے واپس لیے ہیں اور اب یہ اپنے شہروں کا اس قدر جاں توڑ دفاع کر رہے ہیں کہ بے پناہ گولہ باری کے باوجود سربوں اور کروٹوں کو یہ ہمت نہیں ہو رہی کہ وہ کسی نئے علاقے پر قبضہ کر لیں۔ یہ جہاد کی برکت ہے اور اس کی بدولت روز بروز بوسنیا کے حالات میں استحکام پیدا ہو رہا ہے۔ اس چیز نے دنیا بھر کو انگشت بدنداں کر دیا ہے کہ کس طرح نہتے اور ضروریاتِ زندگی سے محروم لوگ سربوں اور کروٹوں کی مسلح آرمی اور اقوامِ متحدہ کی فوجوں کی کھلم کھلا سربوں کے حق میں جانبداری اور امریکہ اور مغرب کی خوفناک سازش کا مقابلہ کر رہے ہیں اور اسے ناکام بنائے جا رہے ہیں۔

جہادِ کشمیر

جذبۂ جہاد ہی ہے جس نے کشمیری قوم کو راکھ کا ڈھیر ہو جانے کے بعد انتہائی باہمت اور جانباز و سرفروش بنا دیا ہے۔ بھارت نے ۴۵ برس تک اس قوم کی برین واشنگ کی۔ اسے تن آسان، اخلاق باختہ اور اپنا خیمہ بردار بنانے کے لیے اربوں روپے خرچ کیے۔ تعلیمی پروگراموں، معاشی منصوبوں، معاشرتی اصلاحات اور سیاسی ہارس ٹریڈنگ کے ذریعے قطعی طور پر بے حس، بے ضمیر اور بے مقصد بنانے کے ہزاروں جتن کیے اور پھر ساتھ ہی دنیا بھر میں یہ ڈھنڈورا پیٹا کہ کشمیر کا مسئلہ ختم ہو چکا ہے۔ کشمیری قوم بھارت کا جز بن چکی ہے اور کشمیری سیاستدان حقِ خود ارادیت کا نام تک لینا اور پاکستان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ بھارت کے گھاگ دانشور اور تجربہ کار سفارت کار اور منجھے ہوئے اہلِ قلم دنیا کو یقین دلاتے رہے کہ کشمیر، خود کشمیریوں نے بھارت میں شامل کر رکھا ہے۔ اب وہاں کوئی جھگڑا نہیں ہے، بلکہ کشمیر کو خطۂ حسن و جمال جان کر

وہاں سیاحت کے لیے جایا جائے۔

آخرکار کشمیری قوم کو ان سپوتوں نے' جن کی تربیت کشمیر کی تحریکِ اسلامی اپنے تعلیمی اداروں میں کر رہی تھی' اپنے مسئلے کو طاقِ نسیان سے نکال کر بین الاقوامی چوراہے پر لا کر رکھ دیا ہے اور اس راستے میں انھیں ۳۰ ہزار سے زائد افراد کی شہادت دینی پڑی ہے اور ابھی تک دیے جا رہے ہیں۔ ان کی خواتین کی اجتماعی آبروریزی' خانہ سوزی اور نظربندی کے واقعات تو شمار سے باہر ہو چکے ہیں۔ ان کی عبادت گاہیں تک محفوظ نہیں ہیں۔ مگر کیا کہنے جذبۂ جہاد کے جو لحہ لحہ فزوں ہوتا جا رہا ہے۔ حزب المجاہدین اور تحریکِ حریتِ کشمیر کے پروانے آخری بازی لگا رہے ہیں اور اب بڑی طاقتیں پریشان ہو گئی ہیں کہ جہاد کی آگ کو کیسے فرو کیا جائے۔ انھیں یاسر عرفات جیسے ملت فروش کی تلاش ہے۔ ان کی نظر کبھی کسی شخصیت پر پڑتی ہے اور کبھی کسی پر۔ ہمیں امید ہے کہ جس طرح بعض فلسطینی رہنما عالمی سازش کے جھانسے میں آگئے ہیں' کشمیر میں یہ ڈرامہ نہیں دہرایا جائے گا۔

دیگر جہادی تحریکیں

جہاد کی ایک بھٹی تاجکستان میں بھڑک اٹھی ہے۔ وہاں بھی ان شاء اللہ تاجک مجاہدین روسی فوج اور تاجک کمیونسٹوں اور ان کے ازبک حامیوں کے ساتھ وہی کچھ کریں گے جو افغان مجاہدین نے سوویت یونین کے ساتھ کیا۔ جنوبی فلپائن بھی عرصہ طویل سے بنگسا مورو مجاہدین کے قدموں کی چاپ سن رہا ہے۔ وہاں منیلا کے متعصب عیسائی ان کو دبانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر سلامت ہاشم جیسے جری رہنما اپنی قوم کو مسلسل جہاد کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ اراکان (جنوبی برما) میں بھی روہنگیا سالڈیریٹی آرگنائزیشن اراکان کو بری بدھوؤں اور کمیونسٹوں کے پنجۂ استبداد سے نکالنے کے لیے جدوجہد کا آغاز کر چکی ہے۔

قوم پرستی کا خاتمہ

دورِ انحطاط میں سب سے بڑی بیماری جو امتِ مسلمہ کے اندر پھیلی وہ قوم پرستی تھی۔ استعماری طاقتوں نے آکر اس کے اندر مزید اضافہ کیا۔ "قوم پرستی" اس عقیدے اور تہذیب کو ملیامیٹ کر دینے والی بیماری ہے جس عقیدے اور تہذیب کو اللہ کے رسولؐ نے بڑی محنت سے عربوں کے اندر جاگزیں کیا اور پھر ان کے ذریعے عقیدۂ اسلام ہی کی اساس پر امت قائم کی جسے "خیر امت" کہا گیا۔ دورِ جاہلیت میں تو انسانی امتیازات زبان و نسل اور رنگ و علاقہ کی بنیاد پر قائم

کیے جاتے تھے' بلکہ ایک ہی زبان بولنے والے اور ایک ہی علاقے میں بسنے والے قبائل نسلی اختلاف کی بنا پر باہم دست و گریباں ہو گئے۔ قریش و بنو ثقیف' اوس و خزرج اور بنو خزاعہ اور بنوبکر ایک ہی زبان' ایک ہی علاقے اور ایک ہی تاریخ کے وارث تھے مگر باہم برسرپیکار تھے اور ایک دوسرے پر تفاخر و تفاضل ان کا شیوہ تھا۔ اور پھر عرب قبائل اپنے آپ کو عجمی قبائل پر برتر سمجھتے تھے۔ اس قوم پرستی اور قبیلہ پرستی نے انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے اور خونریزی' جنگ و جدل اور بے جا تعلی کو جنم دے کر انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی روک دی تھی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ۲۳ سالہ جدوجہد میں اس بیماری کا قلع قمع کر دیا اور فخر و فضیلت کی بنیاد زبان و نسل اور علاقہ و رنگ کے بجائے عقیدے کی پختگی اور تقویٰ و شرافت میں سبقت پر استوار کر دی۔ عربی و فارسی اور رومی و افریقی سب یکساں ہو گئے۔ نہ رنگ کا امتیاز باقی رہا اور نہ زبان کا۔ عربوں کے اندر بھی جلیل القدر ہستیاں اسلامی تہذیب کو چار چاند لگاتی رہیں اور عجمیوں کے اندر بھی ایسے ماہتاب و آفتاب اٹھے جنھوں نے تفسیر و حدیث' فقہ و قانون' حکمت و فلسفہ اور علم و فن میں امتِ مسلمہ کو پوری انسانیت پر بالا کر دیا۔ زیلع (اریٹریا) کا صاحبِ نصب الرایہ اور بخارا (ازبکستان) کا امام بخاریؒ' اندلس کا صاحب الموافقات شاطبیؒ اور دہلی کا صاحب الحجة اللّٰه البالغة' شاہ ولی اللہؒ دہلوی اس گلدستۂ امت کے یکساں قابلِ فخر' یکساں چشمۂ فیض اور یکساں مرجعِ ہدایت شخصیتیں تھیں۔

عہدِ استعمار میں قوم پرستی کا ظہور

صدیوں تک ان رنگ برنگ پھولوں کا گلدستہ کرۂ ارض پر اپنی خوشبو بکھیرتا رہا۔ بے شک درمیان میں کبھی کبھی محدود پیمانے پر نسبی اور لسانی نعرے سر اٹھاتے رہے' مگر عقیدۂ اسلام کی قوت کے آگے وہ اٹھتے اور مرجاتے۔ جیسے جیسے عقیدے میں کمزوری اور دینی گرفت میں ضعف پیدا ہوتا گیا قومی اور نسلی نعرے ابھرتے گئے۔ استعماری طاقتوں نے آکر ان نعروں کو خوب ہوا دی اور مسلمانوں کی امتِ واحدہ کو سینکڑوں اقوام و ملل میں بانٹ کر رکھ دیا۔ پہلے عربوں اور غیر عربوں کے اندر امتیاز برپا کیا۔ عرب قومیت کو عربوں کے اندر ہوا دی اور تورانی قومیت کو ترکوں کے اندر پھیلایا اور دونوں میں باہمی جنگ بھڑکا دی۔ عربوں نے ترکوں کو مارا اور ترکوں نے عربوں سے عداوت کو شیوہ بنا لیا۔ پھر عربوں کو باہم تقسیم کیا۔ استعمار نے مصر میں فرعونی قومیت اور قبطی قومیت اٹھائی' شام میں فینقی قومیت کو ابھارا' عراق میں بابلی اور اشوری نسل کو مابہ الامتیاز پیمانہ قرار دیا' لبنان میں قدیم یونانیوں اور رومیوں کے گڑے مردے اکھاڑے' شمالی افریقہ (تونس' الجزائر

اور مراکش) میں عرب اور بربر کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ حالانکہ امام شافعیؒ کا مصر، امام ابوحنیفہؒ کا عراق، امام زہریؒ کا شام، امام اوزاعیؒ کا لبنان، ابن خلدونؒ کا تونس، یوسف بن تاشفینؒ کا مراکش سب عربی اللسان ملک اور عقیدۂ اسلام کی حامل اقوام اور امتِ مسلمہ کے دست و بازو تھے۔ جزیرۃ العرب جسے گہوارۂ اسلام کہا جاتا ہے، نسلوں اور علاقوں میں بٹ گیا۔ حجاز و نجد، صنعا و عدن اور شرقی و غربی کی آوازیں اٹھیں۔ ان آوازوں کے پیچھے محض علاقوں کی تشخیص نہ تھی، بلکہ علاقائی عصبیت بھی کارفرما تھی۔ وسطِ ایشیا میں ترک مسلمان آباد تھے، مگر انھیں ازبک، تاجک، قرغیز، قازق، ترکمان اور آذری و غیر آذری اور شیشانی و انگوشی قوموں کے القاب دیے گئے اور ان کے درمیان نفرت کے پہاڑ حائل کر دیے۔

امتِ واحدۃ کی بحالی کی جدوجہد

قوم پرستی کی یہ جاں لیوا بیماری مسلمانوں کو مضمحل کر چکی تھی۔ اس نے وسیع و عریض امت کے درمیان تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر بڑی بڑی دیواریں کھڑی کر رکھی تھیں اور ابھی تک یہ دیواریں قائم ہیں۔ تحریکِ اسلامی نے ملتِ اسلامی کے لیے جو خدمات سرانجام دی ہیں ان میں یہ خدمت سرفہرست ہے کہ اس نے "امتِ واحدہ" کے تصورِ خوابیدہ کو بیدار کیا ہے۔ اور مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک اور ترکی سے لے کر صومالیہ تک، بلکہ مدغاسکروما ریشس تک بسنے والے مختلف رنگ و نسل کے مسلمانوں کو ایک امت ہونے کا احساس دلایا ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ جہاں اسلامی عقیدہ بیدار ہو گیا ہے وہاں نسلی و لونی تفرقے مٹ چکے ہیں اور جیسے جیسے تحریکوں کا کام پھیلتا جا رہا ہے، یہ تفرقے محو ہوتے جا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تحریکوں کے قائدین، ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور حسن البناؒ کسی مخصوص قوم یا ملک کے رہنما نہیں، بلکہ پوری ملت کے چشم و چراغ سمجھے جاتے ہیں۔ سیّد قطب، بدیع الزماں نورسی، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی، شیخ محمد محمود الصواف، عبدالحمید بن بادیس، محمد البشیر الابراہیمی اور عزالدین القسام (اللہ ان سب پر اپنی رحمت نازل فرمائے) کے ساتھ عقیدت کا دائرہ پوری اسلامی دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ ان کی تحریریں اور کاوشیں کسی مخصوص علاقے اور مخصوص تمدن کی پابند نہیں ہیں، بلکہ پوری امت کے مسائل سے بحث کرتی ہیں۔ ان کی تحریریں دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور ہر جگہ نسلِ نو ان کو اپنے سینے سے لگاتی ہے۔ دورِ حاضر کے موجودہ قائدین بھی ایک ہی گروہ اور ایک ہی جماعت شمار کیے جاتے ہیں۔ پاکستان کی جماعتِ اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد، بنگلہ دیش کی جماعتِ اسلامی کے امیر پروفیسر غلام اعظم، بھارت کی جماعتِ اسلامی کے امیر مولانا سراج الحسن، مقبوضہ

کشمیر کے رہنما سیّد علی گیلانی' آزاد کشمیر کی جماعتِ اسلامی کے امیر عبدالرشید ترابی' ملائشیا کی اسلامک پارٹی کے سربراہ فاضل نور' افغان مجاہدین' خلیجی ممالک کے اسلامی رہنما' اردن میں اخوان المسلمون کے مراقبِ عام محمد عبدالرحمٰن خلیفہ' لبنان میں جماعۃ اسلامیۃ کے امیر فتحی یکن' اخوان المسلمون کے مرشد عام محمد حامد ابو النصر' اسلامک نیشنل فرنٹ کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر حسن ترابی' تونس کی نہضت اسلامی کے جلاوطن امیر راشد الغنوشی' الجزائر کے اسلامک سالویشن فرنٹ کے نظریہ ساز سربراہ ڈاکٹر عباس مدنی' ترکی کی رفاہ پارٹی کے صدر نجم الدین اربکان' وسطِ ایشیا کی جمہوریتوں اور وفاقِ روس کے مختلف علاقوں کی اسلامی تحریک حزبِ نہضت کے صدر احمد القاضی' تاجکستان کے رہنما شریف ہمت زادہ اور یورپ و امریکہ میں رہنے والے مسلم رہنما ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ یہ ایک ہی کارواں ہے جس کے اصل قائد جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور جس کا منشور اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے' جو اسی کارواں کا تسلسل ہیں جو عہدِ صحابہ اور عہدِ تابعین سے چلا آ رہا ہے۔ جس کی قیادت اپنے اپنے دور میں آئمہ کرام' مجددینِ عظام اور مصلحینِ امت کرتے رہے ہیں۔ یہ کارواں قومیتوں سے پیدا ہونے والے امتیازات اور جاہلی تعصبات کی دیواروں اور جغرافیائی حد بندیوں کو ختم کر کے امت کے ہر ہر گروہ کو باہم پیوستہ کر رہا ہے۔ اور اسے وہی حیثیت دینا چاہتا ہے جو حدیث میں بیان کی گئی ہے کہ جسم کے ایک حصے کو تکلیف پہنچے تو دوسرا حصہ بھی تکلیف اور بے خوابی میں مبتلا ہو جائے۔ فلسطین کے مسلمانوں کی تکلیف ہو یا بوسنیا کے مسلمانوں کی آزمائشیں' کشمیریوں پر ٹوٹنے والا ظلم و ستم ہو یا تاجکستان پر لہرانے والی شمشیرِ ستم' اراکانی مسلمانوں کے زخم ہوں یا فلپائنی مسلمانوں کی لرزہ خیز داستان' ساری ملت اس میں حصہ دار ہے۔ کیا اسلامی تحریک کا یہ کارنامہ اس دور کا سب سے بڑا معجزہ نہیں ہے؟ اس معجزے کی شب تاب شعاعیں دنیا نے جہادِ افغانستان میں دیکھیں جس میں افغانیوں کے دوش بدوش پوری دنیا کی اسلامی تحریکوں کے نوجوانوں نے بھی اپنا خون بہایا' اور آخرکار سوویت یونین کا "قصرِ شکوہ" دیکھتے ہی دیکھتے زمین بوس ہو گیا۔